 

19-09-2018

مقامِ تسلیم ورضا

مفتی منیب الرحمٰن

تسلیم ورضا کے معنی ہیں: ''اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردینا، اپنی نفسانی خواہشات وترجیحات کو اللہ کی رضا کے تابع کر دینا، اپنی انا کو اس کی رضا میں فنا کردینا، اسی کو فنافی اللہ بھی کہتے ہیں، انگریزی میں اسے Total Submission سے تعبیر کیا جاتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے اسی معنویت کو ان آیات مبارکہ میں بیان فرمایا ہے:

(1) ''اور لوگوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اپنی جان کا سودا کرلیتا ہے، (بقرہ:207)''۔

(2) ''بے شک اللہ نے اہلِ ایمان سے اُن کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خریدلیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں، اللہ کا اس پر تورات، انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے، سوتم اپنے اس سودے پر، جو تم نے اللہ سے کیا ہے، خوشی مناؤ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے، (توبہ:111)''۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب ومقرب بندوں کو آزمائش کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! سب سے زیادہ سخت آزمائش کس کی ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے، پھر اُن کی جو مرتبے میں اُن سے قریب تر ہیں اور پھر حسبِ مراتب، (سنن ترمذی:2398)''، یعنی: ''جن کے رتبے ہیں سوا، اُن کو سوا مشکل ہے''۔ اسی سنتِ الٰہیہ کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی آزمائش کے کڑے مرحلے سے گزرنا پڑا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا، تو وہ اس آزمائش میں پورا اترے، اللہ نے فرمایا: میں تمہیں انسانیت کا امام بنانے والا ہوں، (بقرہ:124)''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرات ابراہیم واسماعیل علیہم السلام کی آزمائش کے مختلف مراحل میں سے ایک کا ذکر کیا اور فرمایا: ''سو جب (باپ بیٹا) دونوں نے (اللہ کے حکم پر) سرِ تسلیم خم کردیا اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹادیا اور ہم نے اُسے پکارا: اے ابراہیم! بے شک آپ نے اپنا خواب سچا کردکھایا اور بے شک ہم نکوکاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں، بے شک یہ ضرور کھلی آزمائش تھی، (الصّٰفّٰت 106-103)''۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو امتحان میں پورا اترنے پر اس اعزاز سے نوازا: ''بے شک ابراہیم اپنی ذات میں ایک امت تھے، اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار، باطل سے ہٹ کر حق پر قائم رہنے والے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں

کے شکر گزار تھے، (اللہ نے) انہیں چن لیا اور ان کو سیدھے راستے کی ہدایت فرمائی اور ہم نے ان کو دنیا میں اچھائی عطا فرمائی اور بے شک وہ آخرت میں بھی نکوکاروں میں سے ہوں گے، (النحل 122-120)"۔

تسلیم و رضا کا یہ شِعار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے توسط سے رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ تک پہنچا۔ غزوۂ حنین میں قبیلۂ ہوازن کی شدید تیر اندازی کے سبب جب وقتی طور پر مجاہدین کے قدم اکھڑ گئے تو رسول اللہ ﷺ تنہا میدان میں پوری استقامت کے ساتھ کھڑے رہے اور فرمایا: "میں نبی ہوں یہ کوئی جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں"۔ رسول اللہ ﷺ سے اللہ کی راہ میں عزیمت و استقامت اور جاں نثاری کی یہ وراثت آپ کے اہلِ بیتِ اطہار کو منتقل ہوئی اور میدانِ کربلا میں امام عالی مقام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اہلِ بیتِ اطہار و اعوان و انصار رضی اللہ عنہم کے ذریعے یہ روایت اپنی معراج کو پہنچی، علامہ اقبال نے کہا تھا:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حُسین، ابتدا ہے اسماعیل

اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقرّب بندے سراپا تسلیم و رضا ہوتے ہیں، وہ اللہ کی قضا و قدر پر شاکی نہیں ہوتے بلکہ راضی رہتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جب بھی عبدالرحمٰن بن ملجم کو دیکھتے تو اس کی نشاندہی اپنے قاتل کے طور پر کرتے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا: "آپ اس کو قتل کیوں نہیں کرتے"، اس پر حضرت علی نے کہا: "میں اپنے قاتل کو کیسے قتل کردوں، (الفخری فی آداب السلطانیہ، ج:1، ص:105)"۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا علم تھا، چنانچہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کے جسم پر مٹی لگی ہوئی دیکھی تو فرمایا: "اے ابوتراب! میں تمہیں دو بد بخت ترین آدمیوں کے بارے میں نہ بتادوں، حضرت علی نے عرض کیا: یارسول اللہ! ضرور بتایئے، آپ ﷺ نے فرمایا: (ایک) قوم ثمود کا اُحَیۡمِرُ ہے، جس نے (حضرت صالح علیہ السلام کی) ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اے علی! (دوسرا) وہ شخص ہوگا جو تمہارے سر پر ضرب لگائے گا اور خون سے تمہارے جبڑے تک تر ہو جائے گا، (مسند احمد:18321)"۔

یہ تمام حقائق اس بات پر شاہد ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا علم تھا اور شاید قاتل کا بھی علم تھا، اسی لیے انہوں نے اپنے قاتل کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ برضا و رغبت شہادت کے لیے تیار رہے۔ یہی صورتِ حال امام عالی مقام حسین رضی اللہ عنہ کی بھی تھی کہ شہادت کی منزل انہیں آفتاب نصف النہار کی طرح اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آرہی تھی، لیکن آپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی اور اس منزل کو پانے کے لیے آپ تیار رہے۔ شبِ عاشور کو انتہائی فصیح و بلیغ کلمات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد آپ نے فرمایا: "جو آج کی شب اپنے خاندان والوں کے پاس جانا چاہتا ہے تو میں اسے اجازت دیتا ہوں، تم پر رات کی ظلمت چھا چکی ہے، تم میں سے ہر ایک میرے گھر کے ایک فرد کا ہاتھ پکڑ لے اور رات کی تاریکی میں اپنے خاندانوں کی طرف نکل جائے، اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے، قوم کو صرف میرا خون چاہیے، جب وہ مجھے شہید کردیں گے تو ان کی پیاس بجھ جائے گی، کسی اور سے انہیں کیا غرض"۔ آپ کے اہلبیت کے مردوں نے کہا: "آپ کے بعد جینے میں کوئی مزا نہیں ہے، لوگ کہیں گے: تم نے اپنے بزرگوار، اپنے سردار، اپنے چچازاد اور بہترین چچا کو تنہا چھوڑ دیا، تم نے ان کی مدافعت میں ایک تیر اور ایک نیزہ بھی نہ چلایا، دنیاوی زندگی کی خاطر تم نے تلوار تک نہ چلائی۔ واللہ! ہم آپ پر اپنی جانوں، اپنے مالوں اور اپنے اہل

 

وعیال کو قربان کر دیں گے اور آخری سانس تک آپ کی مدافعت میں لڑیں گے، آپ کے بعد جینے کا کیا مزا''۔

الغرض وہ سب کوہِ استقامت تھے، موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے باوجود آپ کا ساتھ نہ چھوڑا، مقامِ تسلیم ورضا اسی کا نام ہے کہ انسان جب دنیاوی نفع ونقصان سے ماورا ہو کر حیاتِ ابدی اور رضائے الٰہی کو اپنی منزل بنالیتا ہے، تو اُس کے لیے جان کی قربانی بھی آسان ہوتی ہے، علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

برتر از اندیشۂ سود وزیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہ ناپ　　جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

صبحِ عاشور آپ نے اتمامِ حجت کرتے ہوئے حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا: کیا مجھ جیسی شخصیت کو قتل کرنا تمہیں گوارا ہے، میں تمہارے نبی کا شہزادہ ہوں اور آج میرے سوا اللہ کی زمین پر کسی نبی کا فرزند موجود نہیں ہے، علی میرے باپ ہیں، جعفرِ طیار میرے چچا ہیں، سید الشہداء حمزہ میرے والد کے چچا ہیں، میرے اور میرے بھائی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''یہ دونوں نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں، میرا مقام جاننا ہو تو اصحابِ رسول سے پوچھو''۔ لیکن ان کے دلوں پر مہر لگ چکی تھی اور سعادت ان کے مقدر میں نہ تھی۔

شعارِ تسلیم ورضا کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے میدانِ کربلا میں اُس معراج تک پہنچایا کہ جس کی نظیر تاریخِ انسانیت میں نہیں ملتی۔ اللہ کی راہ میں ایثار وقربانی کا کوئی ایسا عنوان باقی نہ رہا جسے آپ نے اپنی نسبت سے مُشرَّف نہ کیا ہو۔ اس سے پہلے جب آپ مدینۂ منورہ سے عزمِ سفر کرنے لگے تو جلیل القدر صحابہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت ابوسعید خدری وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کو اس سفر سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اہلِ کوفہ کی جفا کا بھی حوالہ دیا، لیکن آپ اپنے عزم پر قائم رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اہلِ کوفہ نے بڑی تعداد میں خطوط بھیج کر آپ کو آنے کی دعوت دی تھی اور امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے آپ کی بیعت کا وعدہ کیا تھا۔ آپ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے نسبتِ قرابت، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرزند اور حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا لختِ جگر ہونے اور اپنے علم اور ورع وتقویٰ کے سبب آپ خلافت کے اہل ہیں۔ چنانچہ آپ عمرہ ادا کرنے کے بعد منازلِ سفر طے کرتے ہوئے کربلا پہنچے اور محرم الحرام 61ھ کے یوم عاشور کو جب کوفے کی مساجد سے اذانِ جمعہ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، شقی القلب لوگ تقریباً اُسی وقت نواسۂ رسول کی گردن پر خنجر چلا رہے تھے۔ یہ منظر کسی بھی مسلمان کے لیے ناقابلِ تصور ہے، لیکن امت کی بدنصیبی کہ بظاہر یہ ناممکن فعل واقع ہوا اور آج تک اس پر تمام اہلِ ایمان اور محبانِ رسول ﷺ ومحبانِ اہلِ بیتِ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین رنجیدہ ہیں۔

لیکن ستم یہ ہے کہ محبتِ حسین کے دعوے دار تو بہت ہیں اور اپنے اپنے انداز میں ان کی یاد بھی مناتے ہیں، ان کا غم بھی تازہ کرتے ہیں اور مجالس بھی منعقد کرتے ہیں، مگر اُن کی اقدار کو زندہ کرنے والے آج بھی کم یاب بلکہ نایاب ہیں، علامہ اقبال نے سچ کہا تھا:

گرچہ تابدار ہے، اب بھی گیسوئے دجلہ وفرات　　قافلۂ حجاز میں، ایک حسین بھی نہیں

(روزنامہ دنیا، 19 ستمبر 2018ء)

mu